علامہ شبلی نعمانی

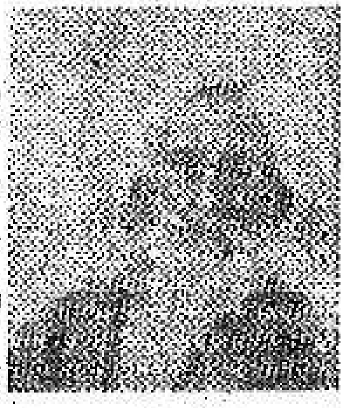

علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھ کے مشہور وکیل مولوی شیخ حبیب اللہ کے فرزند تھے۔ ان کی پیدائش مئی 1857ء مطابق ذی قعدہ 1274ھ کو بندول ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ مولوی شکر اللہ سے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد غازی پور گئے۔ وہاں مستند استاد مولانا محمد فاروق کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ مولانا ہی نے شبلی کے ساتھ نعمانی کا لفظ بڑھا دیا۔ رام پور میں انہوں نے فقہ اور منطق کی کتابیں پڑھیں۔ وہاں سے لاہور چلے گئے جہاں ان کو مولانا فیض الحسن پروفیسر اورینٹل کالج جیسا استاد مل گیا۔ عربی ادب کی تکمیل انہوں نے وہاں کی اور پھر سہارن پور میں مولانا احمد علی سے کتب حدیث کا درس لیا۔

شبلی کے والد چونکہ ایک کامیاب وکیل تھے اور ان کے استاد مولانا محمد فاروق بھی وکیل تھے، والد بزرگوار نے وکالت پاس کرنے کو کہا۔ شبلی نے والد کے حکم کی تعمیل میں وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ لیکن اس پیشہ میں اکل حلال کا دروازہ انہیں بند محسوس ہوا۔ اس لیے اس سے الگ ہو گئے۔

1882ء میں شبلی علی گڑھ گئے۔ وہاں سرسید سے ملاقات ہوئی۔ تبادلۂ خیال ہوا۔ ہم مزاجی محسوس ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ حسن اتفاق کہ ان دنوں علی گڑھ کالج میں ایک عہدہ پروفیسر کا خالی تھا۔ سرسید نے انہیں چالیس روپے ماہوار پر مقرر کر لیا۔ سرسید شبلی کی صلاحیتوں کے معترف ہوتے گئے۔ سرسید نے اپنا پورا کتب خانہ شبلی کو مطالعہ کے لیے وقف کر دیا۔ شبلی 1892ء میں قسطنطنیہ پہنچے اور چند مہینوں تک بلادِ اسلامیہ کا سفر کرتے رہے۔ 1894ء میں انہیں سلطنت ہند کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔

سرسید کے انتقال کے بعد 1898ء میں شبلی مستعفی ہو کر اعظم گڑھ لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے نیشنل اسکول قائم کیا۔ پھر وہ حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون کے عہدہ پر چار سال تک کام کرتے رہے۔ انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی تو شبلی اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ شبلی ندوۃ العلما لکھنؤ کے بھی ناظم مقرر ہوئے لیکن 1913ء میں اس سے بھی الگ ہو گئے۔ پھر اعظم گڑھ منتقل ہو گئے اور یہاں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اس قومی خدمت کے لیے اپنا باغ، اپنا مکان اور کتب خانہ وقف کر دیا۔ یہ ادارہ تحقیق و تصنیف کا کام کرتا رہا۔

علامہ شبلی کا نام اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بڑے ہی احترام سے لیا جاتا ہے اور ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی تصنیفات میں شعر العجم، الفاروق، سیرۃ النبیؐ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ 57 سال کی عمر میں 18 نومبر 1914ء مطابق 28 ذی الحجہ 1332ھ بروز چہارشنبہ کو علامہ شبلی کا انتقال ہو گیا۔

تعلیم قدیم و جدید

کیاان میں سے کوئی غیرضروری ہے؟؛ کیا ان دونوں میں تعارض ہے؟ کیا ان میں کسی اصلاح کی ضرورت ہے؟ دونوں مل کر کیوں کر کام کر سکتے ہیں؟

اگر چہ یہ سوالات قومی مسئلہ کے متعلق اہم اور ضروری سوالات ہیں۔لیکن قوم نے کبھی ان سوالات پر مستقل حیثیت سے بحث نہیں کی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو دنیوی اور دینی درس گاہیں یا انجمنیں ملک میں قائم ہیں۔ ان کو جو کامیابی اس وقت حاصل ہے وہ اس پر قانع تھیں۔اس لیے ان مسائل کو حل کرنے کی ان کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مثلاً اسلامی کالجوں میں سیکڑوں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں۔ ہر سال سیکڑوں ایم۔اے اور بی۔اے ہو کر نکلتے ہیں۔سیکڑوں فارغ شدہ طلبہ نے معقول نوکریاں حاصل کیں۔سیکڑوں وکالت کر رہے ہیں۔سیکڑوں اپرنٹس اور امیدوار ہیں۔ان باتوں کے ہوتے ان کو اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ قدیم تعلیم کی ضرورت اور اس کے نتائج اور ترمیم و اصلاح کا سودا مول لیں۔

اس کے مقابلہ میں عربی مدارس دیکھ رہے ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ مساجد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں مولوی تیار ہو گئے ہیں۔ ہر ہر ضلع میں عربی کے چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہوتے جاتے ہیں۔ ہر جگہ واعظوں کی مانگ ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ان کو کیا غرض ہے کہ وہ جدید تعلیم کی ضرورت اور نتائج پر غور کرنے کی زحمت اٹھائیں۔

لیکن اب اس سکون میں کچھ جنبش پیدا ہو چلی ہے کیوں کہ اب ہر گروہ جس قسم کی تعلیم کا حامی ہے، چاہتا ہے کہ تمام ملک میں وہی تعلیم پھیل جائے، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں گروہوں میں تقابل، مسابقت اور محاسدہ پیدا ہو۔ چنانچہ ایسا ہوا۔صرف یہ امتیاز باقی رہا کہ پست حوصلہ لوگوں نے اعلانیہ اپنے حریف مدارس اور انجمنوں کی برائی شروع کی اور مہذب حضرات نے دل آزاری اور بدگوئی سے احتراز کیا۔

اگر چہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں سے دونوں کو بہ قدر کافی اپنے کام کے لیے مدد مل

سکتی ہے۔ لیکن واقعی اب اس کا وقت آ گیا ہے کہ تمام قوم مل کر ایک وسیع خاکہ تیار کر دے جس میں تمام درس گاہوں اور انجمنوں کی نسبت طے کر دیا جائے کہ کون کون ضروری ہیں، کس حد تک ضروری ہیں اور مجوزہ نقشہ ہر ایک کی جگہ کہاں ہے؟ تا کہ جو کام ہو رہے ہیں، سب مل کر ایک کام بن جائیں اور ایک کام دوسرے کام میں خلل انداز نہ ہونے پائے ورنہ دو طرفہ کشمکش میں ہزاروں لاکھوں مسلمان یہ فیصلہ نہ کر سکیں گے کہ وہ کس رخ اور کدھر جائیں؟

اس غرض سے سوالات ذیل پر نظر ڈالنی چاہیے۔

جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟

علی گڑھ، دیو بند، ندوہ کے کیا حدود ہیں اور کون کون کام کس کس کے حدِ عمل میں چھوڑ دینے چاہئیں۔

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا اور اگر کسی کو ہو تو ہم کو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن میں دفعتاً نفی کی صورت میں آئے گا، لیکن ان کو ذرا غور سے کام لینا چاہئے اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہیے۔

کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا اور کچھ ہے؟

اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قائم رہے گی؟

اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم، قدیم تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن ہے؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بہ قدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے، لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں۔ کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں، ان کے مقابلہ کے لیے اتنی تعلیم کافی ہے؟ کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قائم ہو سکتا ہے؟

تیسرا سوال یعنی یہ کہ دونوں طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں، ایک معرکہ کا سوال ہے۔ نہ اس لئے کہ درحقیقت وہ ایسا ہے بلکہ اس لیے کہ دونوں فریق ایک مدت سے اسی حالت پر قائم ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق کامیاب ہیں۔ اس لئے ان کو اعلانیہ نظر آتا ہے کہ اصلاح کی ضرورت نہیں۔ تاہم جدید گروہ بہ آسانی اپنے خلاف نکتہ چینی سننے پر آمادہ ہوسکتا ہے؟ اس لئے پہلے ہم انھیں سے خطاب کرتے ہیں۔

اس قدر مسلم ہونے کے بعد کہ تعلیم جدید کے ساتھ کسی قدر مذہبی تعلیم ضروری ہے۔ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس ضرورت کی مقدار کیا ہے اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی خدمات یعنی امامت، وعظ، افتا کا کام لینا نہیں ہے، بلکہ غرض یہ ہے کہ وہ خود بہ قدر ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں۔ اس کے لیے صرف ایک مختصر اور جامع و مانع سلسلۂ کتب دینیات کی ضرورت ہے۔ جس میں سلسلہ بہ سلسلہ اسکول سے کالج کلاسوں تک کی قابل ذکر کتابیں ہوں۔ اس سلسلہ میں تین قسم کی کتابیں ہونی چاہئیں۔ فقہ، عقائد، تاریخ اسلام، فقہ اور تاریخ کے متعلق مصر میں عمدہ کتابیں تیار ہوگئی ہیں۔ ان کا ترجمہ کافی ہوگا۔ عقائد کی نسبت البتہ مشکل ہے، کیوں کہ ہندستان میں جو کتابیں آج کل لکھی گئی ہیں ان پر ابھی تمام لوگوں کا اتفاق نہیں ہوسکتا اور مصر وغیرہ کی جدید تصانیف ناکافی اور ناقابلِ درس ہیں۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ اسکول کلاسوں میں صرف فقہ اور تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو اور کالج کلاسوں میں امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تصنیفات خود عربی ہی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کہ کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہیں پیدا ہوسکتا۔ بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے چاروں طرف، مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے۔ دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے۔ مذہبی علماء بیش قرار مشاہرہ کے مقرر کیے جائیں۔ وعظ کے موقعوں پر اکثر ارکانِ کالج تاامکان شریک ہوں، مذہبی پابندی کی بنا پر طلبہ کی خاص توقیر اور تحسین کی جائے اور سب سے مقدم یہ کہ دو چار طلبہ کو گراں بہا وظائف دے کر ڈگری حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ درجہ کی مذہبی تعلیم دلائی جائے۔

یہ امر اگرچہ بدیہی ہے کہ قدیم تعلیم میں سخت اصلاح اور اضافہ کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علماء اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں۔ اس لیے ہم ان سے سوالاتِ ذیل کے جواب چاہتے ہیں:

۱۔ یورپ کے مصنفین، مذہب پر جو حملہ کر رہے ہیں، اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

۲۔ اگر علما خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے؟

۳۔ مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں۔ ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟

۴۔ علما جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے، جواب کیوں کر دے سکیں گے؟

۵۔ کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیئے تھے؟

۶۔ اگر اس وقت اس زمانے کے فلسفہ کا سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں ہے؟

ان سوالات کا اگرچہ خود بخود یہ جواب ہوگا کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم ان علما کو جو کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں خیال کرتے اصلاح پر مجبور کریں۔ اس کی وجہ ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مثلاً دیہات کے جاہل مسلمانوں میں احکام اسلام کا پھیلانا اتنا بڑا وسیع کام ہے جس کے لیے سیکڑوں ہزاروں مولویوں اور واعظوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مساجد کی امامت اور فتویٰ وغیرہ بہت سے کام ہیں جو محض خالص قدیم تعلیم یافتہ حضرات انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے تقسیم عمل کی رو سے یہ کام اس گروہ کے ہاتھ میں دے دینے چاہئیں اور ہر طرح پر ان کی تائید و اعانت اور احترام کرنا چاہیے۔ اس نقطۂ خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو جو لوگ قدیم عربی مدارس کو بیکار بتاتے ہیں۔ وہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہے۔ صرف ہم کو اس کا استعمال صحیح طور سے کرنا چاہیے۔ البتہ اس قسم کے قدیم مدرسوں میں اس قسم کی تربیت پر اصرار کرنا چاہیے جس سے تعصب، سخت دلی تنگ خیالی نہ پیدا ہو جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پرانے مولوی اور جدید تعلیم یافتہ ایک صحبت میں بسر نہیں کر سکتے اور ہر موقع پر دونوں دو حریف کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو دربار نبوی کا نمونہ پیش نظر رکھنا چاہیے جہاں کافروں اور منافقوں تک کو بار ملتا تھا اور ان کی بھی خاطر داری کی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تو ان کو حکم ہوا کہ قولا لہ قولا لینا یعنی

فرعون سے نرمی سے بات کرنا۔

دونوں گروہ اب قوم کے ضروری اجزا ہیں۔ اس لیے دونوں کو آپس میں دست و بازو ہو کر کام کرنا چاہیے۔

لیکن علما کے جس گروہ نے جدید ضرورتوں کا اندازہ کیا ہے اور اس کے موافق عربی تعلیم میں اصلاح و اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان اصول کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہیں جو ندوہ نے اختیار کیا ہے اور جو عملی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اگر قوم ان واقعات کو پیش نظر رکھے تو آج کل قوم کی کوششوں کی پراگندگی کا جو اعتراض ہے وہ اٹھ جائے اور لوگ اطمینان اور سکون اور بے تعصبی کے ساتھ اپنی اپنی حدود میں محدود رہ کر اپنے کاموں کو انجام دیں۔

لفظ و معنی

جنبش	۔	حرکت
حریف	۔	مخالف
مجوزہ نقشہ	۔	تجویز کیا ہوا نقشہ
اعتراضات	۔	اعتراض کی جمع
تصانیف	۔	تصنیف کی جمع

آپ نے پڑھا

- مولانا شبلی نے تعلیم کے قدیم اور جدید تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں کے فوائد پر تفصیل سے اور مثالوں کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔
- مولانا کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لیے قدیم تعلیم کے ساتھ جدید طرز کی تعلیم سے بھی واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے مذہب سے بھی آگاہ رہیں اور بدلتے ہوئے رجحانات پر بھی ان کی نظر رہے۔
- مولانا کا یہ بھی خیال ہے کہ مدرسوں میں اس طرح کی تعلیم دی جانی چاہیے جس سے تعصب اور تنگ خیالی پیدا نہ ہو۔

آپ بتائیے

1. علامہ شبلی کہاں پیدا ہوئے؟

2. ان کی کسی ایک تصنیف کا نام بتائیے۔

3. علامہ شبلی کیا کبھی انجمن ترقی اردو کے صدر بھی تھے؟

4. کیا علامہ شبلی ندوۃ العلما میں بھی رہے؟

5. دارالمصنفین کو کس نے قائم کیا؟

مختصر گفتگو

1. جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

2. قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

3. دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟

4. کیا ان دونوں میں ٹکراؤ ہے؟

5. علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب کب ملا؟

تفصیلی گفتگو

1. تعلیم قدیم و جدید سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

2. علامہ شبلی نے دونوں طرح کی تعلیم کے دائرہ کار کو کس طرح متعین کیا ہے؟

3. علامہ شبلی نے قدیم و جدید تعلیم میں اصلاح کی کیا تجویزیں پیش کی ہیں؟

4. ایک مضمون لکھ کر علامہ شبلی کے خیالات و کارناموں کو واضح کیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. علامہ شبلی کی کوئی ایک تصنیف جو آپ کو پسند ہو اپنے سامنے رکھ کر اس کے اہم نکات لکھیے۔

2. تعلیم قدیم و جدید کے مضمون سے جو پیغام ملتا ہے، اس کو عام کرنے کی کوشش کیجیے۔

3. اس فکر کو عام کیجیے کہ تعلیم قدیم و جدید دونوں فائدہ مند ہے اور اسے حاصل کرنا چاہیے۔